مُشتاق احمد یُوسفی

بارے آلو کا کُچھ بیاں ہوجائے

دوسروں کو کیا نا م رکھیں،ہم خود بیسیوں چیزوں سے چِڑتے ہیں ـــ کرَم کلاّ ، پنیر،کمبل اور کافکا، عورت کاگانا، مرد کا ناچ، گیندے کا پھول، اتوار کا ملاقاتی،مرغی کا گوشت، پاندان، غرارہ، خوبصورت عورت کا شوہر ـــ زیادہ حدِّ ادب کہ مکمّل فہرست ہماری فردِ گناہ سے بھی زیادہ طویل اور ہری بھری نکلے گی ۔ گنہ گار سہی لیکن مرزا عبدالودود بیگ کی طرح یہ ہم سے آج تک نہ ہوا کہ اپنے تعصُّبات پر معقولات کا نیم چڑھا کر دوسروں کو اپنی بے لطفی میں برابر کا شریک بنانے کی کوشش کی ہو۔مرزا تو بقول کَسے ،غلط اِستدلا ل کے بادشاہ ہیں ،اُن کی حمایت و وکالت سے معقول سے معقول ''کاز'' نہایت لچر معلوم ہونے لگتا ہے۔اسی لیے ہم سب انھیں تبلیغِ دین اور حکومت کی حمایت سے بڑی سختی سے باز رکھتے ہیں ۔ ان کی ایک چِڑ ہو تو بتائیں۔فہرست رنگا رنگ ہی نہیں ،اتنی غریب پرور بھی ہے کہ اس میں فقیرِ بے تقصیر کا نام بھی خاصی او نچی پوزیشن پر شامل رہ چکا ہے ۔بعد میں ہم سے یہ پوزیشن بینگن کے بھُرتے نے چھین لی اور اس سے جیکی کینیڈی کے دولہا اوناسِس نے ہتھیا لی ۔ مرزا کو آج جو چیز پسند ہے کل وہ دل سے اُتر جائے گی اور پرسوں تک چِڑ بن جائے گی۔ لوگ ہمیں مرزا کا ہمدم ہی نہیں ،ہمزاد بھی کہتے ہیں لیکن اِس یگانگت و تقرُّب کے باوجود ہم وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ مرزا نے آلو اور ابو الکلا م آزاد کو اوّل اوّل اپنی چِڑ کیسے بنایا۔نیز دونوں کو تہائی صدی سے ایک ہی بریکٹ میں کیوں بند کر رکھا ہے ؟

بوئے یاسمن با قیست

مولاناکے باب میں مرزا کو جتنا کھُرچا، تعصّب کے مُلمّع کے نیچے خالص مَنطق کی یہ موٹی موٹی تہیں نکلتی چلی گئیں۔ ایک دن کئی وار خالی جانے کے بعد ارشاد فرمایا: ''ایک صاحبِ طرز انشاء پرداز نے بانیِ ندوۃ العلماء

کے بارے میں لکھا ہے کہ شبلی پہلا یونانی تھا جو مسلمانوں میں پیدا ہوا ۔اس پر مجھے یہ گرہ لگانے کی اجازت دیجیے کہ یونانیوں کی اس اسلامی شاخ میں ابو الکلام آخری اہلِ قلم تھا جس نے اُردو رسم الخط میں عربی لکھی!'' ہم نے کہا''ان کی شفاعت کے لئے یہی کافی ہے کہ انھوں نے مذہب میں فلسفے کا رس گھولا۔ اُردو کو عربی کا سوز وآہنگ بخشا'' فرمایا،''اُن کی نثر کا مطالعہ ایسا ہے جیسے دلدل میں تیرنا ! اسی لیے مولوی عبدالحق اعلانیہ انھیں اردو کا دُشمن کہتے تھے۔ علم و دانش اپنی جگہ ، مگر اس کو کیا کیجیے کہ وہ اپنی اَنا اور اُردو پر آخری دَم تک قابو نہ پاسکے۔ کبھی کبھار رمضان میں اُن کا ترجُمانُ القرآن پڑھتا ہوں تو (اپنے دونوں گالوں پر تھپڑ مارتے ہوئے) نعوذ باللہ محسوس ہوتا ہے گویا کلام اللہ کے پردے میں ابوالکلام بول رہا ہے !'' ہم نے کہا '' لاحول ولا قوۃ! اس بزرگ کی تمام کردہ و نا کردہ خطائیں تمھیں صرف اس بِنا پر معاف کر دینی چاہئیں کہ تمھاری طرح وہ بھی چائے کے رسیا تھے ۔ کیا نام تھا اُن کی پسندیدہ چائے کا؟ اچّھا سا نام تھا۔ ہاں ! یاد آیا۔ وہائٹ جیسمین ! یا سمنِ سفید!'

شگفتہ ہوئے ۔فرمایا '' مولانا کا مشروب بھی ان کے مشرب کی مانند تھا۔ٹوٹے ہوئے بتوں کو جوڑ جوڑ کر اِمامُ الہند نے ایسا معبود تراشنے کی کوشش کی جو اہلِ سومنات کو بھی قابل قبول ہو۔ یونانی فلسفے کی عینک سے جب انھیں دین میں دنیا اور خدا میں ناخدا کا جلوہ نظر آنے لگا تو وہ مسلمان ہوگئے اور سچے دل سے اپنے آپ پر ایمان لے آئے ۔اسی طرح یہ چینی چائے محض اس لیے ان کے دل کو بھا گئی کہ اس میں چائے کے بجائے چنبیلی کے گجرے کی لپٹ آتی ہے۔ حالانکہ کوئی شخص جو چائے پینے کا ذرا بھی سلیقہ رکھتا ہے، اس لیے چائے پیتا ہے کہ اس میں چائے کی ـــــ فقط چائے کی ـــــ مہک آتی ہے ، نہ کہ چنبیلی کے تیل کا بھبکا۔''

ہم نے کہا،''تعجب ہے! تم اس بازاری زبان میں اس آبِ نشاط انگیز کا مضحکہ اُڑا رہے ہو، جو بقول مولانا 'طبعِ شورش پسند کو سرمستیوں کی اور فکرِ عالم آشوب کو آسودگیوں کی دعوت دیا کرتی تھی۔''' اِس جملے سے ایسے بھڑکے کہ بھڑکتے چلے گئے۔ لال پیلے ہوکر بولے، ''تم نے لپٹن کمپنی کا قدیم اشتہار 'چائے سردیوں میں گرمی اور گرمیوں میں ٹھنڈک پہنچاتی ہے' دیکھا ہوگا۔ مولانا نے یہاں اسی جملے کا ترجمہ اپنے مدّاحوں کی

آسانی کے لیے اپنی زبان میں کیا ہے۔!'' بحث اور دل شکنی کا یہ سلسلہ کافی دیر تک جاری رہا۔ لیکن مزید نقلِ کفر کرکے ہم اپنی دنیا وعاقبت خراب کرنا نہیں چاہتے ۔ لہذا اس تشبیب کے بعد مرزا کی دوسری چِڑ یعنی آلو کی طرف گُریز کرتے ہیں۔

یہ دانت سلامت ہیں جب تک

مرزا کا ''باس'' دس سال بعد پہلی مرتبہ تین دن کی رُخصت پر جا رہا تھا اور مرزا نے اپنے مشیروں اوربہی خواہوں کو جشنِ نجات منانے کے لیے بیچ لکژری ہوٹل میں لنچ پر مدعُو کیا تھا۔ وہاں ہم نے دیکھا کہ سمندری کچھوے کا شوربہ سُڑ سُڑ پینے کے بعد مرزا مُسلَّم کیکڑے (مُسلَّم کے معنی یہ ہیں کہ مرحُوم کی سالم ٹانگیں، کھپرے، آنکھیں اور مونچھیں پلیٹ پر اپنی قدرتی حالت میں نظر آرہی تھیں) پر ٹوٹ پڑے۔ہم نے کہا، ''مرزا! ہم نے تمھیں چھکا مارتی خمیری نان کھاتے دیکھا ہے، کھروں کے چٹپٹے سریش میں ڈبو ڈبوکر ،جسے تم دلّی کے نہاری پائے کہتے ہو۔ مُفت کی مل جائے تو سڑاندی سارڈین یوں نگلتے ہو گویا ناک نہیں رکھتے اور تو اور زنگا ماٹی میں چکما قبیلے کی ایک دوشیزہ کے ہاتھ سے نشیلا کسیلا جیک فروٹ لپ لپ کھاتے ہوئے فوٹو کھنچوا چکے ہو۔ اور اُس کے بعد پشاور میں چڑوں کے پکوڑے کھاتے ہوئے بھی پکڑے جا چکے ہو۔تمھارے مشربِ اکل وشرب میں ہر شے حلال ہے سوائے آلو کے!''

کِھل گئے ،فرمایا،''ہم نے آج تک کسی مولوی ـــــ کسی فرقے کے مولوی کی تندرستی خراب نہیں دیکھی۔ نہ کسی مولوی کا ہارٹ فیل ہوتے سُنا۔ جانتے ہو کیا وجہ ہے؟ پہلی وجہ تو یہ کہ مولوی کبھی ورزش نہیں کرتے۔دوسری وجہ یہ کہ سادہ غذا اور سبزی سے پرہیز کرتے ہیں!''

ہوٹل ہذا اور آلو کی عمل داری

سبزی نہ کھانے کے فوائد ذہن نشین کرانے کی غرض سے مرزا نے اپنی زیرِ تجربہ زندگی کے ان گوشوں کو بے نقاب کیا جو آلو سے کیمیائی طور پر متاثر ہوئے تھے۔ ذکر آلو کا ہے۔انھی کی زبان غیبت بیان سے اچّھا معلوم ہوگا:

تمھیں تو کیا یاد ہوگا۔ دسمبر ۱۹۵۱ء میں منٹگمری گیاتھا۔ پہلی دفعہ کراچی سے باہر جانے کی مجبوری لاحق ہوئی تھی۔ منٹگمری کے پلیٹ فارم پراترتے ہی محسوس ہوا گویا سردی سے خون رگوں میں جم گیا ہے۔ادھر چائے کے اسٹال کے پاس ایک بڑے میاں گرم چائے کے بجائے مالٹے کا رس پیئے چلے جارہے تھے۔ اس بندۂ خدا کو دیکھ دیکھ کر اور دانت بجنے لگے۔ کراچی کا دائمی حبس اور بغیر کھڑکیوں والا کمرہ بے طرح یاد آئے ۔قلی اور تانگے والے سے صلاح ومشورے کے بعد ایک ہوٹل میں بستر ا لگا دیا۔جس کا اصلی نام آج تک معلوم نہ ہوسکا۔لیکن منیجر سے لے کر مہتر تک سبھی اسے ہوٹل ہذا کہتے تھے۔ کمرہ صرف ایک ہی تھا جس کے دروازے پر کوئلے سے بحُروفِ انگریزی وارڈ و ''کمرہ نمبر ا'' لکھاتھا۔ ہوٹل ہذا میں نہ صرف یہ کہ کوئی دوسرا کمرہ نہیں تھا ، بلکہ مستقبل قریب یا بعید میں اس کی تعمیر کا امکان بھی نظر نہیں آتا تھا کیونکہ ہوٹل کے تین طرف میونسپلٹی کی سڑک تھی اور چوتھی طرف اسی ادارے کی مرکزی نالی جو شہر کی گندگی کو شہر ہی میں رکھتی تھی، جنگل تک نہیں پھیلنے دیتی تھی۔ جزیرہ نمائے کمرہ نمبرا، میں ''اٹیچڈ باتھ روم'' تو نہیں تھا، البتہ ایک اٹیچڈ تنور ضرور تھا۔ جس سے کمرہ اس کڑاکے کی سردی میں ایسا گرم رہتاتھا کہ بڑے بڑے ''سنٹرلی ہیٹیڈ'' ہوٹلوں کو مات کرتا تھا۔ پہلی رات ہم بنیان پہنے سورہے تھے کہ تین بجے صبح جو تپش سے ایکا ایکی آنکھ کُھلی تو دیکھا کہ امام دین بیرا ہمارے سرہانے ہاتھ بھر لمبی خون آلود چُھری لیے کھڑا ہے۔ ہم نے فوراً اپنی گردن پر ہاتھ پھیرکر دیکھا۔ پھر چپکے سے بنیان میں ہاتھ ڈال کر پیٹ پر چٹکی لی اور پھر کلمہ پڑھ کے اتنی زور سے چیخ ماری کہ امام دین اُچھل پڑا اور چُھری چھوڑ کر بھاگ گیا۔تھوڑی دیر بعد دو تین بیرے سمجھا بُجھا کر اُسے واپس بُلا لائے۔ اس کے اوسان بجا ہوئے تو معلوم ہوا کہ چُھری سے وہ ننھی ننھی بٹیریں ذبح کر رہاتھا۔ ہم نے ایک وقار کے ساتھ کہا،'' عقلمند آدمی! یہ پہلے کیوں نہ بتایا؟'' اس نے فوراً اپنی بھول کی معافی مانگی اور وعدہ کیا کہ آئندہ وہ پہلے ہی بتا دیا کرے گا کہ چُھری سے بٹیر ہی ذبح کرنا چاہتا ہے ۔نیز اس نے آسان پنجابی میں یہ بھی یقین دلایا کہ آئندہ وہ چیخ سُن کر ڈرپوکوں کی طرح خوفزدہ نہیں ہُوا کرے گا۔

ہم نے رسان سے پوچھا،''تم انھیں کیوں ذبح کررہے تھے؟'' بولا'' جناب ! ضلع منٹگمری میں جانور کو حلال کرکے کھاتے ہیں۔ آپ بھی کھائیں گے ؟'' ہم نے قدرے ترُش روئی سے جواب دیا '' نہیں!'' اور

ریلوے ٹائم ٹیبل سے پنکھا جھلتے ہوئے سوچنے لگے کہ جو لوگ دودھ پیتے بچّوں کی طرح جلدی سوتے اور جلدی اُٹھتے ہیں ، وہ اس رمز کو کیا جانیں کہ نیند کا اصل مزہ اور سونے کا صحیح لطف آتا ہی اس وقت ہے جب آدمی اُٹھنے کے مقرّرہ وقت پر سوتا رہے کہ اِسی ساعت ِدُزدیدہ میں نیند کی لذّتوں کا نزول ہوتا ہے۔ اسی لیے کسی جانور کو صُبح دیر تک سونے کی صلاحیت نہیں بخشی گئی۔ اپنے اَشرفُ المخلُوقات ہونے پر خود کو مبارکباد دیتے دیتے صُبح ہوگئی اور ہم پوری اور آلو چھولے کا ناشتہ کرکے اپنے کام پر چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد معدے میں گرانی محسوس ہوئی، لہذا دوپہر کو آلو پلاؤ اور رات کو آلو اور پنیر کا قورمہ کھاکر تنور کی گرمائی میں ایسے سوئے کہ صُبح چار بجے بیرے نے اپنے مخصوص طریقے سے ہمیں جگایا۔ جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

ناشتے سے پہلے ہم سر جھکائے قمیص کا بٹن نوچ کر پتلُون میں ٹانکنے کی کوشش کررہے تھے کہ سوئی کچھ سے انگلی میں بُھک گئی۔ بالکل اضطراری طور پر ہم نے اُنگلی اپنی قمیص کی جیب پر رکھ کر زور سے دبائی۔ مگر جیسے ہی دوسری غلطی کا احساس ہوا تو خون کے گیلے دھبّے پر سفید پاؤڈر چھڑک کر چُھپانے لگے اور دل میں سوچنے لگے کہ اللہ تعالیٰ نے بیوی بھی کیا چیز بنائی ہے۔ لیکن انسان بڑا ہی نا شکرا ہے ۔اپنی بیوی کی قدر نہیں کرتا۔اتنے میں بیرا مقامی خالص گھی میں تلی ہوئی پوریاں لے آیا۔ منٹگمری کا اصلی گھی پاکستان بھر میں سب سے اچّھا ہوتا ہے۔اس میں چار فی صد گھی ہوتا ہے۔ بیرے نے حسبِ معمول اپنے ابروئے تساہُل سے ہمیں کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور جب ہم اس پر ۴ کے ہِندسے کی طرح تہرے ہوکر بیٹھ گئے تو ہمارے زانو پر گیلا تولیہ بچھایا اور اس پر ناشتے کی ٹرے جماکر رکھ دی[1]۔ ہم نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو اسے

---

[1] ممکن ہے بعض شکّی مزاج قارئین کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ اگر کمرے میں میز یا اسٹول نہیں تھا تو بان کی چارپائی پر ناشتہ کیوں نہ کر لیا۔ شکایتاً نہیں، اطلاعاً عرض ہے کہ جیسے ہی منٹگمری کا پہلا مرغ پہلی بانگ دیتا ،بیرا ہماری پیٹھ اور چارپائی کے درمیان سے بستر ایک ہی جھٹکے میں گھسیٹ لیتا۔ اپنے زورِ بازو اور روز مرّہ کی مشق سے اس کام میں اتنی صفائی اور مہارت پیدا کرلی تھی کہ ایک دفعہ سہرا نے کھڑے ہوکر جو بستر گھسیٹا تو ہمارا بنیان تک اُتر کر بستر کے ساتھ لپٹ کر چلا گیا اور ہم کھری چارپائی پر کیلے کی طرح چھلے ہوئے پڑے رہ گئے ۔پھر چارپائی کو پائینتی سے اُٹھا کر ہمیں سر کے بل پھسلاتے ہوئے کہنے لگا ،''صاحب ! فرنیچر خالی کرو !'' وجہ یہ ہے کہ اس فرنیچر پر سارے دن ''پروپرائٹر اینڈ منیجر ہوٹل ہذا '' کا دربار لگا رہتا تھا۔ایک دن ہم نے اس بے آرامی پر پُر زور احتجاج کیا تو ہوٹل کے قواعد وضوابط کا پنسل سے لکھا ہوا ایک نُسخہ ہمیں دکھایا گیا، جس کے سرورق پر ''ضابطہ فوجداری ہوٹل ہذا '' تحریرتھا۔اس کی دفعہ ۹ کی رُو سے فجر کی اذان کے بعد ''پسنجر '' کو چارپائی پر سونے کا حق نہیں تھا۔البتہ قریبُ المرگ مریض ۔زچہ اور یہود و نصاریٰ اس سے مستثنیٰ تھے ۔لیکن آگے چل کر دفعہ ۲۸(ب) نے ان سے

جھاڑن منہ میں ٹھونسے بڑے ادب سے ہنستے ہوئے پایا۔ ہم نے پوچھا ''کیوں ہنس رہے ہو؟'' کہنے لگا ''وہ تو منیجر صاحب ہنس رہے تھے۔ بولتے تھے، ہم کو لگتا ہے کہ کراچی کا پسنجر بٹیر کو تِلیر سمجھ کے نہیں کھاتا!''

ہر چیز کے دو پہلو ہُوا کرتے ہیں ۔ایک تاریک، دوسرا زیادہ تاریک لیکن ایمان کی بات ہے اس پہلو پر ہماری نظر بھی نہیں گئی تھی اور اب اس غلط فہمی کا ازالہ ہم پر واجب ہوگیا تھا۔ پھُولی ہوئی پوری کا لقمہ پلیٹ میں واپس رکھتے ہوئے ہم نے رُندھی ہوئی آواز میں اس جعل ساز پرند کی قیمت دریافت کی۔ بولا ''زندہ یا مُردہ؟'' ہم نے جواب دیا کہ ہم تو شہر میں اجنبی ہیں ۔ فی الحال مُردہ کو ہی ترجیح دیں گے۔ کہنے لگا ''دس آنے پلیٹ ملتی ہیں ۔ایک پلیٹ میں تین بٹیریں ہوتی ہیں ۔ مگر جناب کے لئے تو ایک ہی راس کافی ہوگی۔

قیمت سُن کر ہمارے مُنہ میں بھی پانی بھر آیا ۔پھر یہ بھی تھا کہ کراچی میں مویشیوں کا گوشت کھاتے کھاتے طبیعت اُکتا گئی تھی۔ لہٰذا دل ہی دل میں عہد کرلیا کہ جب تک منٹگمری کا آب ودانہ ہے ،طیور کے سوا کسی چیز کے ہاتھ نہیں لگائیں گے۔ لنچ پر بُھنی ہوئی بٹیر، چائے کے ساتھ بٹیر کا تنوری چرغا، سونے سے پہلے بٹیر کا آب جوش۔ اِس رہائشی تنور میں فرو کش ہوئے ہمیں چوتھا دن تھا، اور تین دن سے یہی اللّے تللّے تھے۔ چوتھی صبح ہم زانو پہ تولیہ اور تو لیے پر ٹرے رکھے تلی ہوئی بٹیر سے ناشتہ کر رہے تھے کہ بیرے نے جھاڑن پھر منہ میں ٹھونس لی۔ ہم نے چمک کر پوچھا، ''اب کیا بات ہے؟'' کہنے لگا،''کچھ نہیں۔ منیجر صاب ہنس رہے تھے۔ بولتے تھے کمرہ نمبر ا کے ہاتھ بٹیر لگ گئی ہے!'' ہم نے طنزاً ایٹیچڈ تنور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا ''تمہارے ہوٹل ہذا میں اور کون سا من و سلویٰ اُترتا ہے؟'' بولا، ''حرام گوشت کے سوا دُنیا بھر کی ڈِش ملتی ہے۔ جو چاہیں آرڈر کریں، جناب! ـــــ آلو مٹر، آلو گوبھی، آلو میتھی، آلو گوش، آلو مچّھی، آلو بریانی، اور خدا تمہارا بھلا کرے، ـــــ لو کوفتہ، آلو بڑیاں، آلو سموسہ، آلو کا رائتہ، آلو کا بھُرتا، آلو کیماں (قیمہ)۔۔۔۔

بھی یہ مراعات چھین لی تھیں۔اس کی رُو سے زچہ اورقریبُ المرگ مریض کو زچگی اور موت سے تین دن پہلے تک ہوٹل میں آنے کی اجازت نہیں تھی ۔ خلاف ورزی کرنے والوں کو بیروں کے حوالے کردیا جائے گا۔''

ہم نے روک کر پوچھا ''اور سویٹ ڈِش؟'' بولا ''آلو کی کھیر'' ہم نے کہا، ''بھلے آدمی! تم نے تو آلو کا پہاڑہ سُنا دیا۔ تمہارے ہوٹل میں کوئی ایسی ڈش بھی ہے جس میں آلو کا نام نہ آئے۔ فاتحانہ تبسم کے ساتھ فرمایا، ''کیوں نہیں! پوٹے ٹو کٹلٹ! حاضر کروں جناب؟''

قصّہ در اصل یہ تھا کہ ایک سال پہلے مالک ہوٹل ہٰذا نے ہیڈ کانسٹبل کے عہدے سے سُبکدوش ہوکر زراعت کی طرف توجہ فرمائی اور زمین سے بھی انہی ہتھکنڈوں سے سونا اُگلوانا چاہا۔ مگر ہُوا یہ کہ آلو کی کاشت میں پچیس سال کی ذہانت سے جمع کی ہوئی رشوت ہی نہیں بلکہ پنشن اور پراویڈنٹ فنڈ بھی ڈوب گئے۔

زمیں کھا گئی بے ایماں کیسے کیسے

پس انداز کئے ہوئے آلوؤں سے ہوٹل کے دھندے کا ڈول ڈالا۔ جنہیں اب اس کے بہترین دوست بھی تازہ نہیں کہہ سکتے تھے۔ سنا ہے بٹیر بھی اسی زمانے میں پاس پڑوس کے کھیتوں سے پکڑ لئے تھے۔

مکالمہ در مذمّتِ آلو

''مرزا! یہ بٹیر نامہ اپنی جگہ، مگر یہ سوال ابھی تِشنہ ہے کہ تم آلو کیوں نہیں کھاتے۔'' ہم نے پھر وہی سوال کیا۔

نہیں صاحب! آلو کھانے سے آدمی آلو جیسا ہو جاتاہے۔کوئی انگریز[1] عورت جسے اپنا ''فِگر'' اور مستقبل ذرا بھی عزیز ہے، آلو کو چھوتی تک نہیں۔ سامنے سوئمنگ پول میں پیر لٹکائے یہ میم جو مصر کا بازار کھولے بیٹھی ہے، اُسے تم آلو کی ایک ہَوائی بھی کھلا دو تو بندہ اسی حوض میں ڈوب مرنے کو تیار ہے۔ اگر یہ کافی میں چینی کے چار دانے بھی ڈالتی ہے، یا کوئی اسے میٹھی نظر سے بھی دیکھ لے، تو اس کی کیلوریز کا حساب اپنی دھوبی کی کاپی میں رکھتی ہے۔'' انھوں نے جواب دیا۔

''مرزا! کیا میمیں بھی دھوبی کی کاپی رکھتی ہیں؟''

''ہاں! ان میں کی جو کپڑے پہنتی ہیں، وہ رکھتی ہیں''

---

[1] انگریز: مرزا کی عادت ہے کہ تمام سفید فام غیر ملکیوں کو انگریز کہتے ہیں۔ مثلاً امریکہ کے انگریز، جرمنی کے انگریز، حد یہ کہ انگلستان کے انگریز۔

''ہماری تشنگیِ علم بڑھتی دیکھ کر مرزا نے آلو کی ہجو میں دلائل و نظائر کا طومار باندھ دیا۔ جہاں کہیں منطق کے ٹاٹ میں ذرا سوراخ بھی نظر آیا، وہاں مخملی مثال کا بڑا سا پیوند اس طرح لگایا کہ جی چاہتا تھا کہ کچھ سوراخ ہوتے۔ کہنے لگے کرنل شیخ کل رات ہی یورپ سے لوٹے ہیں۔ کہہ رہے تھے یورپ کی اور ہماری خواتین میں بڑا فرق ہے۔ یورپ میں جو لڑکی دور سے سترہ برس کی معلوم ہوتی ہے وہ قریب پہنچ کر ستر برس کی نکلتی ہے۔ اور ہمارے ہانجو خاتون دور سے ستر برس کی دکھلائی پڑتی ہے وہ نزدیک آنے پر سترہ کی نکلتی ہے! مگر یہ وضعداری انگلستان میں ہی دیکھی کہ جو عمر دور سے نظر آتی ہے وہی پاس سے۔ چنانچہ کمر کمر تک بالوں والی جو لڑکی دور سے انیس سال کی نظر آتی ہے وہ پاس جانے پر بھی انیس ہی سال ''ہپی'' نکلتا ہے! خیر سُنی سُنائی باتوں کو چھوڑو۔ اس میم کا مقابلہ اپنے ہاں کی آلو خور خواتین سے کرو۔ ادھر فانوس کے نیچے، سرخ ساری میں جو محترمہ لیٹر بکس بنی اکیلے اکیلے گپا گپ بیف اسٹیک اور آلو اُڑا ہیں۔اماں! گنواروں کی طرح اُنگلی سے اشارہ مت کرو۔ ہاں! ہاں! وہی، ارے صاحب کیا چیز تھی! لگتا تھا ایک اپسرا سیدھی اجنتا کے غاروں سے چلی آ رہی ہے اور کیا فگر تھا۔ کہتے ہوئے زُبان سو سو بل کھاتی ہے۔

چلتی تو قدم یوں رکھتی تھی دن جیسے کسی کے پھرتے ہیں

پہلے پہل مارچ ۱۹۵۱ میں دیکھا تھا۔ وہ صبح یاد آتی ہے تو کوئی دل پر دستک سی دینے لگتا ہے۔ اور اب؟ اب تمھاری آنکھوں کے سامنے ہے ۔بارہ سال پہلے کی Go-Go Girl گوشت کے انبار میں کہیں کھوگئی۔ عشق اور آلو نے اِن حالوں کو پہنچا دیا۔

ہم نے کہا، ''ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ!'' بولے، ''اہل زبان کے محاورے انہی کے خلاف اندھا دُھند استعمال کرنے سے پہلے پوری بات تو سن لیا کرو۔ حمیرہ وہ آئیڈیل عورت تھی جس کے خواب ہر صحتمند آدمی دیکھتا ہے ـــــ یعنی شریف خاندان، خوبصورت اور آوارہ! اردو، انگریزی، فرنچ اور جرمن فراٹے سے بولتی تھی، مگر کسی بھی زبان میں ''نہ'' کہنے کی قُدرت نہیں رکھتی تھی۔ حُسن اور جوانی کی بشرکتِ غیرے مالک تھی۔یہ دونوں اشیائے لطیف جب تبرک ہو گئیں او رپلکوں کے سائے گہرے ہو چلے تو مارے باندھے ایک عقدِ شرعی بھی ہو گیا۔ مگر ایک مہینے کے اندر ہی دولہا نے عروسی کمر بند کا پھندا گلے میں ڈال کر خود کشی کر لی۔ جا تجھے

کشمکشِ عقد سے آزاد کیا۔ پھر تو ایسے کان ہوئے کہ اس بچاری نے شرعی تکلفات سے خود کو کبھی مکلّف نہیں کیا۔ صاحب! مرد کا کیا ہے آج کل مرد زندگی سے اکتا جاتا ہے تو شادی کر لیتا ہے۔ اور اگر شادی شدہ ہے تو طلاق دے دیتا ہے۔ لیکن عورت ذات کی بات اور ہے۔بدی پہ آئی ہوئی عورت جب پریشان یا پشیمان ہوتی ہے تو ٹی،ایس ایلیٹ کے بقول گراموفون ریکارڈ لگا کر اپنے جوڑے کو میکانکی انداز سے تھپتھپاتے ہوئے خواب گاہ میں بولائی بولائی نہیں پھرتی، بلکہ غذا سے غم غلط کرتی ہے۔ حمیرہ نے بھی مرد کی بے وفائی کا مقابلہ اپنے معدے سے کیا۔ تم خود دیکھ لو۔ کس رفتار سے آلو کے قتلے قاب سے پلیٹ اور پلیٹ سے پیٹ میں منتقل کر رہی ہے۔ بس اسی نے صورت سے بے صورت کر دیا۔

ہم نے ان کا وقت اور پنی رہی سہی عزت بچانے کی خاطر ان کی ان ''تھیوری'' سے جھٹ اِتّفاق کر لیا کہ زنانہ آوارگی کی روک تھام کے لئے عقد اور آلو سے بہتر کوئی آلہ نہیں کہ دونوں سے بد صورتی اور بد صورتی سے نیک چلنی زور پکڑتی ہے۔ ان کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے ہم نے کہا، ''لیکن اگر آلو سے واقعی مُٹاپا پیدا ہوتا ہے تو تمھارے حق میں تو اُلٹا مُفید ہوگا۔کیونکہ اگر تمھارا وزن صحیح مان لیا جائے تو معیاری حساب سے تمہارا قد تین فِٹ ہونا چاہیئے۔ ایک دن تمہیں نے بتایا تھا کہ آستین کے لحاظ سے ۱۷ نمبر کی قمیض تمھیں فِٹ آتی ہے اور کالر کے لحاظ سے ۱۳ نمبر!

کرشمے کاربو ہائیڈریٹ کے

اسی سال جون میں مرزا اپنے دفتر میں اگاتا کرسٹی کا تازہ ناول پڑھتے پڑھتے اچانک بے ہوش ہو گئے۔ ہوش آیا تو خود کو ایک آرام دہ کلینک میں کمپنی کے خرچ پر صاحبِ فراش پایا۔ انہیں اس بات سے سخت مایوسی ہوئی کہ جس مقام پر انہیں دل کا شدید درد محسوس ہوا تھا، دل اس سے بالشت بھر دور نکلا۔ ڈاکٹر نے وہم دور کرنے کی غرض سے انگلی رکھ کر بتایا کہ دل یہاں نہیں، یہاں ہوتا ہے۔ اس کے بعد انہیں دل کا درد دل ہی میں محسوس ہونے لگا!

جیسے ہی ان کے کمرے سے ''مریض سے ملاقات منع ہے'' کی تختی ہٹی، ہم زینیا کا گلدستہ لے کر عیادت کو پہنچے۔ دونوں ایک دوسرے کی شکل دیکھ دیکھ کر خوب روئے۔ نرس نے آ کر دونوں کو چُپ کرایا اورہمیں علاحدہ لے جا کرمتنبہ کیا کہ اس اسپتال میں بیمار پُرسی کرنے والوں کو رونا اور کراہنا منع ہے۔ ہم نے فوراً خود پر فرمائشی بشاشت طاری کر کے مرزا کو ہراساں ہونے سے منع کیا اور تلقین کی کہ مریض کو اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیئے، وہ چاہے تو تنکے میں جان ڈال دے۔ ہماری نصیحت کا خاطر خواہ بلکہ اس سے بھی زیادہ اثر ہوا۔

'' تم کیوں روتے ہو پگلے؟'' ہم نے اُن کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''یونہی خیال آ گیا کہ اگر تم مر گئے تو میری عیادت کو کون آیا کرے گا!'' مرزا نے اپنے آنسو نرس کے رومال میں محفوظ کرتے ہوئے وجہِ رقت بیان کی۔

مرض کی اصل وجہ ڈاکٹروں کے نزدیک کثرتِ افکار تھی جسے مرزا کی زبانِ قادر البیان نے کثرتِ کار بنا دیا۔ خیر، اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں تھی۔ تعجب کی بات تو یہ تھی کہ مرزا چائے کے ساتھ آلو کے ''چپس'' اُڑا رہے تھے۔ ہم نے کہا، ''مرزا! آج تم رنگے ہاتھوں پکڑے گئے۔'' بولے (اور ایسی آواز میں بولے گویا کسی اندھے کنوئیں کے پیندے سے بول رہے ہیں) ڈاکٹر کہتے ہیں تمہارا وزن بہت کم ہے۔ تمہیں آلو اور ایسی چیزیں خوب کھانی چاہیئں جن میں 'اسٹارچ' اور 'کاربو ہائی ڈریٹ' کی افراط ہو۔ صاحب! آلو ایک نعمت ہے، کم از کم سائنس کی رو سے!'' ہم نے کہا، ''تو پھر دبا دب آلو کھا کر ہی صحت یاب ہو جاؤ۔'' فرمایا، ''صحت یاب تو مجھے ویسے بھی ہونا پڑے گا۔ اس لئے کہ یہ نرسیں اس قدر بدصورت ہیں کہ کوئی آدمی جو اپنے منہ پر آنکھیں رکھتا ہے، یہاں زیادہ عرصے پڑا نہیں رہ سکتا!''

وہ نئے گلے، وہ شکایتیں، وہ مزے مزے کی حکایتیں

کلینک سے نکلتے ہی مرزا نے اپنی توپوں کا رُخ پھیر دیا۔ خوگرِ ہجو کے شب و روز اب آلو کی تعریف و

توصیف میں بسر ہونے لگے۔ ایک وقت تھا کہ ویت نام پر امریکی بمباری کی خبریں پڑھ کر مرزا پچھتاوا کرتے کہ کولمبس نے امریکہ دریافت کر کے بڑی نادانی کی۔ مگر اب پیار میں آتے تو آلو کی گدرائی ہوئی گولائیوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے فرماتے، ''صاحب! کولمبس جہنّم میں نہیں جائے گا۔ اسے واپس امریکہ بھیج دیا جائے گا۔ مہذّب دُنیا پر امریکہ کے دو احسان ہیں، تمباکو اور آلو۔ سو تمباکو کا بیڑا تو سرطان نے غرق کر دیا۔ مگر آلو کا مستقبل نہایت شاندار ہے۔ جو ملک جتنا غُربت زدہ ہوگا، اتنا ہی آلو اور مذہب کا چلن زیادہ ہوگا۔''

اور کبھی ایسا بھی ہوتا کہ حریفِ ظریف سائنسی ہتھیاروں سے زیر نہیں ہُوا تو شاعری کی مار سے وہیں ڈھیر کر دیتے۔ ''صاحب! جوں جوں وقت گزرتا ہے یاد داشت کمزور ہوتی جاتی ہے۔ پہلے اپنی پیدائش کا دن ذہن سے اُترا۔ پھر مہینہ اور اب تو سنہ بھی یاد نہیں رہتا۔ بیگم یا کسی بد خواہ سے پوچھنا پڑتا ہے۔ اکثر تمہارے لطیفے تمہیں ہی سنانے بیٹھ جاتا ہوں۔ وہ تو جب تم پیٹ پکڑ پکڑ کر ہنسنے لگتے ہو تو شک گزرتا ہے کہ لطیفہ تمہارا ہی ہوگا۔ بیگم اکثر کہتی ہیں کہ کاک ٹیل پارٹیوں اور ڈانس میں تمہیں یہ تک یاد نہیں رہتا کہ تمہاری شادی ہو چکی ہے! غرض کہ حافظہ بالکل چوپٹ ہے۔ اب یہ آلو کا اعجاز نہیں تو اور کیا ہے کہ آج بھی کسی بچّے کے ہاتھ میں بھو بل یں سنکا ہوا آلو نظر آجائے تو اس کی مانُوس مہک سے بچپن کا ایک ایک واقعہ ذہن میں تازہ ہو جاتا ہے۔ میں ٹکٹکی باندھ کر اُسے دیکھتا ہوں۔ اس سے پھوٹتی ہوئی سوندھی بھاپ کے پرے ایک بھولی بسری صورت اُبھرتی ہے۔ گرد آلود بالوں کے پیچھے شرارت سے روشن آنکھیں۔ کرتا بٹنوں سے بے نیاز، گلے میں غُلیل، ناخن دانتوں سے کترے ہوئے۔ پتنگ اُڑانے والی اُنگلی پر ڈور کی خون آلود لکیر، بیری سمے ہولے ہولے اپنی کینچلیاں اُتارتا چلا جاتا ہے اور میں ننگے پاؤں تتلیوں کے پیچھے دوڑتا، رنگ برنگے بادلوں میں ریزگاری کے پہاڑ، پریوں اور آگ اُگلتے اژدہوں کو بنتے بگڑتے دیکھتا ـــــ کھڑا رہ جاتا ہوں۔''

''یہاں تک کہ آلو ختم ہو جاتا ہے!'' ہم نے صابن کے بلبلے پر پھونک ماری۔
سنبھلے۔ گردشِ ایّام کو اپنے بچپن کے پیچھے دوڑاتے دوڑاتے لگام کھینچی۔ اور گالی دینے کے لئے گلا

صاف کرتے ہوئے فرمایا، ''۔۔۔ خدا جانے حکومت آلو کو بزور قانون قومی غذا بنانے سے کیوں ڈرتی ہے۔ سستا اتنا کہ آج تک کسی سیٹھ کو اس میں ملاوٹ کرنے کا خیال نہیں آیا۔ اسکنڈل کی طرح لذیذ اور زود ہضم! وٹامن سے بھرپور، خوش ذائقہ، صوفیانہ رنگ، چھلکا زنانہ لباس کی طرح، یعنی برائے نام!

صاف ادھر سے نظر آتا ہے ادھر کا پہلو ''

دستِ خود دہانِ خود

مرزا پر اب یہ جھک سوار تھی کہ اگر صندل کا گھسنا اور لگانا دردِ سر کے لئے مُفید ہے تو اسے اُگانا کہیں زیادہ مُفید ہونا چاہیئے۔ حکمت و زراعت کی جن پُرخار راہوں کو مستانہ طے کر کے وہ اس نتیجے پر پہنچے، ان کا اعادہ کیا جائے تو طبّ پر ایک پوری کتاب مرتّب ہو سکتی ہے۔ از بسکہ ہم حکیموں کی لگی لگائی روزی پہ ہاتھ ڈالنا نہیں چاہتے، اس لئے دو تین چنگاریاں چھوڑ کر دور کھڑے ہو جائیں گے۔

ایک دن ہم سے پوچھا، ''بچپن میں کھٹ مٹّھے بیر، میرا مطلب ہے جھر بیری کے بیر کھائے ہیں؟'' عرض کیا، ''جی ہاں! ہزار دفعہ۔ اور اتنی ہی دفعہ کھانسی میں مُبتلا ہُوا ہوں۔'' فرمایا، ''بس یہی فرق ہے، خرید کے کھانے میں اور اپنے ہاتھ سے توڑ کے کھانے میں۔ تجربے کی بات بتاتا ہوں۔ بیر توڑتے وقت اُنگلی میں کانٹا لگ جائے اور خون کی بوند پور پر تھرتھرانے لگے تو آس پاس کی جھاڑیوں کے تمام بیر میٹھے ہو جاتے ہیں!''

''سائنٹیفک دماغ میں یہ بات نہیں آتی۔'' ہم نے کہا۔

ہمارا یہ کہنا تھا کہ زیادہ اُبلے ہوئے آلو کی طرح تڑختے بکھرتے چلے گئے۔ کہنے لگے، ''صاحب! بعضے حکیم یہ کرتے ہیں کہ جس کا معدہ کمزور ہو اُسے اوجھڑی کھلاتے ہیں۔ جس کے گُردوں کا فعل دُرست نہ ہو اُسے گُردے اور جو ضُعف جگر میں مُبتلا ہو اُسے کلیجی۔ اگر میں حکیم ہوتا تو تمہیں مغز ہی مغز کھلاتا۔''

راقمُ الحُروف کے عضوِ ضعیف کی نشاندہی کرنے کے بعد ارشاد ہوا، ''اب آلو خود کاشت کرنے کی سائنٹیفک وجہ بھی سن لو۔ پچھلے سال اُترتی برسات کی بات ہے۔ میں ٹوبہ ٹیک سنگھ میں کالے تیتر کی تلاش میں کچّے میں بہت دور نکل گیا۔ مگر ایک تیتر نظر نہ آیا، جس کی وجہ 'گائیڈ' نے یہ بتائی کہ شکار کے لئے آپ کے پاس ڈپٹی کمشنر کا پرمِٹ نہیں ہے۔ واپسی میں رات ہو گئی اور ہماری 1945 ماڈل جیپ پر دَمے کا دورہ پڑا۔ چند لمحوں بعد وہ ضعیفہ تو ایک گڑھے میں آخری ہچکی لے کر خاموش ہوگئی، مگر اپنے قفسِ عُنصُری میں ہمارے طائرِ روح کو پرواز کرتا چھوڑگئی۔ ہم اسٹیئرنگ پر ہاتھ رکھے دل ہی دل میں خُدا کا شکر ادا کر رہے تھے کہ رحمتِ ایزدی سے جیپ گڑھے میں گری ورنہ گڑھے کی جگہ کُنواں ہوتا تو اس وقت خُدا کا شکر کون ادا کرتا؟ نہ کبھی جنازہ اُٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا! ہمارے قرض خواہوں پر کیا گزرتی؟ ہمارے ساتھ رقم کے ڈوبنے پر اُنہیں کیسے صبر آتا کہ ابھی تو ہمارے تمسّک کی روشنائی بھی خُشک نہیں ہوئی تھی؟ ہم ابھی اُن کے اور اُن کے چھوٹے بچّوں کے سَروں پر ہاتھ پھیر ہی رہے تھے کہ ایک کسان بکری کا نوزائیدہ بچّہ گردن پر مفلر کی طرح ڈالے ادھر سے گُزرا۔ ہم نے آواز دیکر بلایا۔ ابھی ہم اتنی ہی تمہید باندھنے پائے تھے کہ ہم کراچی سے آئے ہیں اور کالے تیتر کی تلاش میں تھے کہ وہ گڑھے کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا کہ تحصیل ٹوبہ ٹیک سنگھ میں تیتر پانی میں نہیں رہتے۔ ہمارے گائیڈ نے ہماری فوری ضروریات کی ترجُمانی کی تو وہ ایسا پسیجا کہ اپنی بیل گاڑی لانے اور اسے جیپ میں جوت کر اپنے گھر لے جانے کے لئے اصرار کرنے لگا اور وہ بھی بلا معاوضہ! صاحب! اندھا کیا چاہے۔۔۔؟''

''دو آنکھیں!'' ہم نے جھٹ لُقمہ دیا۔

''غلط! بالکل غلط! اگر اس کی عقل بھی بینائی کے ساتھ زائل نہیں ہوئی ہے تو اندھا دو آنکھیں نہیں چاہتا، ایک لاٹھی چاہتا ہے!'' مرزا نے محاورے کی بھی اصلاح فرمادی۔

ہم ہُونکا را بھرتے رہے، کہانی جاری رہی، ''تھوڑی دیر بعد وہ بیل گاڑی لے آیا جس کے بیل اپنی جوانی کو بہت پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ ادوان کی رسّی سے جیپ باندھتے ہوئے اس نے ہمیں بیل گاڑی میں اپنے پہلُو میں اگلی سیٹ کی پیش کش کی اور ڈیڑھ دو میل دور کسی موہوم نُقطے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تسلّی دینے لگا،

''او جیڑی، نِویں لالٹین بلدی پئی اے نا، اوہی میرا گھاروے۔''
(وہ جہاں نئی لالٹین جل رہی ہے نا، وہی میرا گھر ہے۔)

گھر پہنچتے ہی اس نے اپنی پگڑی اُتار کر چارپائی کے سیروے والے پائے کو پہنا دی۔ منہ پر پانی کے چھپکے دیئے اور گیلے ہاتھ سفید بکری کی پیٹھ سے پونچھے۔ برسات کی چاندنی میں اس کے کُرتے پر بڑا سا پیوند دور سے نظر آرہا تھا اور جب تھونی پر لٹکی ہوئی نئی لالٹین کی لَو بھڑکی تو اُس پیوند میں لگا ہُوا ایک اور پیوند بھی نظر آنے لگا جس کے ٹانکے ابھی اس کی مُسکراہٹ کی طرح اُجلے تھے۔ اس کی گھر والی نے کھڑی چارپائی پر کھانا چُن کر ٹھنڈے میٹھے پانی کے دو دھات کے گلاس پیڑّی پر بان چِھدرا کر کے جما دیئے۔ میز بان کے شدید اصرار اور بھوک کے شدید تر تقاضے سے مجبور ہوکر جو ہم نے خُشک چنُائی شروع کی ہے تو یقین مانو پیٹ بھرگیا مگر جی نہیں بھرا۔ رال نگلتے ہوئے ہم نے پوچھا، 'چودھری! اس سے مزے دار آلو کا ساگ ہم نے آج تک نہیں کھایا۔ کیا ترکیب ہے پکانے کی؟'

بولا، 'بادشاہو! پہلے تے اِک کلّے زمین وِچ پنج من امریکہ دی کھاد پاؤ۔ فیر---''
(''پہلے ایک ایکڑ زمین میں پانچ من امریکی کھاد ڈالو پھر---'')
اُس زمانے میں کیمیائی کھاد امریکہ سے آتی تھی۔

قصہ آلو کی کاشت کا

بات اگر اب بھی گلے سے نہیں اُتری تو ''خود اُگاؤ خود کھاؤ'' سِلسلے کی تیسری داستان سُنیئے جس کا عذاب ثواب مرزا کی گردن پر ہے کہ وہی اِس کے فردوسی ہیں اور وہی رُستم۔ داستان کا آغاز یوں ہوتا ہے:

''صاحب! بازار سے سڑے بُسے آلو خرید کر کھانے سے تو یہ بہتر ہے کہ آدمی چنے بھسکتا پھرے۔ پرسوں شام ہم خود آلو خریدنے گئے۔ شُبراتی کی دُکان سے۔ ارے صاحب! وہی اپنا شُبراتی جس نے چودہ پندرہ سال سے وہ سائن بورڈ لگا رکھا ہے:

مالکِ ایں دُکان شبراتی مہاجرین
(اگر کوئی دعویٰ کند باطل شود)
بمقام موضع کاٹھ، عقب جامع مسجد کلاں
پوسٹ آفس قصبہ باغپت، ضلع میرٹھ۔
حالِ مقیم کراچی

ہم نے ایک آلو دکھاتے ہوئے کہا، ''میاں شُبراتی! حال مقیم کراچی! تمہارے آلو تو پِلپِلے ہیں۔ خراب لگتے ہیں۔'' بولا، ''باؤ جی! خراب نکلیں تو کالا ناگ (اس کے گدھے کا نام) کے مُوت سے مُونچھ مُنڈوا دینا۔ در حقیقت میں یہ پہاڑی آلو ہیں۔'' ہم نے کہا، ''ہمیں تو کراچی سے پانچ سو میل تک کوئی پہاڑ نقشے میں نظر نہیں آتا۔'' بولا، ''باؤجی! تمہارے نشقے میں اور کون سی پھل پھلاری کراچی میں نجر آوے ہے؟ یہ رُپے چھٹانک کا سانچی پان جو تمہارے غُلام کے کلّے میں بتاشے کی طریوں گُھل ریا ہے، بمقام بنگال سے آریا ہے۔ یھاں کیا دم دُرود رکّھا ہے۔ حالیت تو یہ ہے باؤ جی! کراچی میں مٹّی تلک ملیر سے آوے ہے۔ کس واسطے کہ

اس میں ڈھاکہ سے منگا کے گھانس لگا ویں گے۔ جوانی قسم باؤ جی! پشاور کے چوک یادگار میں مُرغا اذان دیوے ہے تو کہیں جا کے کراچی والوں کو صبح انڈا نصیب ہووے ہے!''

اور ایک مردِ غیرت مند نے چمن زار کراچی کے دل یعنی ہاؤسنگ سوسائٹی میں آلو کی کاشت شروع کر دی۔ اگر چہ سرِ دست پانچ من امریکی کھاد کا انتظام نہ ہو سکا، لیکن مرزا کا جوشِ جنُوں انہیں اُس مقام پر پہنچا چکا تھا جہاں کھاد تو کھاد، وہ بغیر زمین کے بھی کاشت کرنے کا جگرا رکھتے تھے!

مرزا عبد الودود بیگ اور کھیتی باڑی! ہمارا خیال ہے کہ سارا کھیت ایئرکنڈیشن کردیا جائے اور ٹریکٹر میں ایک راکنگ چیئر (جھُولا کُرسی) ڈال دی جائے تو مرزا شاید دو چار گھنٹے کے لئے کاشت کاری کاپیشہ اختیار کرلیں، جس کے بارے میں ان کا مبلغ علم بس اس قدر ہے کہ انہوں نے سنیما کے پردے پر کلین شیو ایکٹروں کو چھاتی پر مصنُوعی بال چپکائے، اسٹوڈیو کے سورج کی دھوپ میں، سگریٹ کی پنّی چڑھی ہوئی درانتیوں سے باجرے کے کھیت میں سے مکّا کے بھُٹّے کاٹتے دیکھا ہے۔ یہاں یہ بتانا غالباً بے محل نہ ہوگا کہ اس سے چند سال پیشتر مرزا باغبانی کا ایک انتہائی نادر اور اتنا ہی ناکام تجربہ کر کے ہمیں ایک مضمون کا خام مواد مہیّا کر چکے تھے۔ انہیں ایک دن اپنے کوٹ کا ننگا کالر دیکھ کر دفعتاً القا ہُوا کہ ہونے کو تو گھر میں اللہ کا دیا سب کچھ ہے سوائے روپے کے، لیکن اگر باغ میں گُلاب کے گملے نہیں تو جینا فضول ہے۔ انہیں زندگی میں اچانک ایک زبر دست خلا محسوس ہونے لگا جسے صرف امریکی کھاد سے پُر کیا جا سکتا تھا۔

اب جو آلو کی کاشت کا سودا سر میں سمایا تو ڈیڑھ دو ہفتے فقط اس موضوع پر ریسرچ ہوتی رہی کہ آلو بخُارے کی طرح آلو کے بھی بیج ہوتے ہیں، یا کوئٹہ کے گُلاب کی طرح آلو کی بھی ٹہنی کاٹ کر صاف سُتھرے گملے میں گاڑ دی جاتی ہے۔ نیز آلو پٹ سن کی مانند گُھٹنوں گُھٹنوں پانی مانگتا ہے یا اخروٹ کی طرح بغیر محنت کے پُشتہا پُشت تک پھل دیتا رہے گا۔ دورانِ تحقیق ایک شق کہیں سے یہ بھی نکل آئی کہ بینگن کی طرح آلو بھی ڈال ڈال پہ لٹکیں گے یا تُرئی کی بیل کی طرح پڑوسی کی دیوار پر پڑے رہیں گے۔ پرو فیسر

عبدالقدّوس نے تو یہ شوشہ بھی اُٹھایا کہ اگر رفعِ شر کی خاطر یہ مان لیا جائے کہ آلو واقعی زمین سے اُگتے ہیں تو ڈنٹھل کا نشان کیسے مٹایا جاتا ہے؟

چُھپا دستِ ہمّت میں دستِ قضا ہے

پھر کیا تھا۔ کوئٹہ سے بذریعہ پی۔ آئی۔ اے۔ سفید گُلاب کی قلمیں منگائی گئیں۔گملوں کو کھولتے پانی اور فنائل سے ''ڈس انفکٹ'' کیا گیا۔ پھر کوئٹہ کے نازک و نایاب گُلاب کو کراچی کے دیمک اور کیڑوں سے محفوظ رکھنے کیلیئے اوباش بکری کی مینگنی کی گرم کھاد میں اتنی امریکی کھاد اور امریکی کھاد میں ہموزن ڈی۔ ڈی۔ ٹی۔ پاؤڈر ملایا گیا۔ اُبلے ہوئے پانی سے صبح و شام سینچائی کی گئی۔ اور یہ واقعہ ہے کہ اِن گملوں میں کبھی کوئی کیڑا نظر نہیں آیا۔ اور نہ گلاب!

پروفیسر قاضی عبد القّدوس کچھ غلط تو نہیں کہتے کہ مرزا حماقت بھی کرتے ہیں تو اس قدر ''اوریجنل'' کہ بخدا بالکل الہامی معلوم ہوتی ہے!

پایان کار مرزا نے آلو کی کاشت کے لئے زمین یعنی اپنا ''لان'' (جس کی افریقی گھاس کی ہریالی ایسی تھی کہ سگرٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے دل دُکھتا تھا) تیار کیا۔ اس زراعتی تجربے کے دوران جہاں جہاں عقل محوِ تماشائے لبِ بام رہی، وہاں جوشِ نمرود بے خطر گلُزارِ خلیل میں کود پڑا۔ دفتر کے چپراسیوں، اپنے پالتو خرگوش اور محلّے کے لونڈے لاڑھیوں کی مدد سے دو ہی دن میں سارا لان کھو د پھینکا۔ بلکہ اس کے بعد بھی یہ عمل جاری رکھا۔ یہاں تک کہ دوسری منزل کے کرایہ داروں نے ہاتھ پاؤں جوڑ کے کھدائی رُکوائی، اس لئے کہ مکان کی نیو نظر آنے لگی تھی۔

۳۲

کوئٹہ کے گُلاب کی طرح آلو کو بھی کراچی کی نظر کھاگئی۔ مگر پنج وقتہ نلائی، گوڑائی اور کُھدائی سے رگ پٹھّوں میں جو چُستی اور طبیعت میں جو چونچالی آگئی تھی، وہ اُسے آلو کی کرامات سمجھتے تھے۔ اب کی دفعہ جو لنچ پر ہمیں ہوٹل انٹر کانٹی ننٹل کے چاندنی لاونج میں لے گئے تو ہم نے دیکھا کہ بُوفے میز پر سوائے ان کیمیائی تجربات کے جو یوروپین باورچیوں نے نسلاً بعد نسلاً آلو پر کئے تھے اور کُچھ نہ تھا___ آلو مُسلّم، آلو دو نیم، آلو سوختہ و کوفتہ، آلو چھلکے دار، آلو بریاں، آلو نیم برِیاں بلکہ کہیں کہیں بلکل عرُیاں!

''مرزا! یہ کیا؟''

'' ٹرپل بی (Busy Businessmen's Buffet)

'' یا اللہ ! کراچی کے کروڑ پتی یہ کھاتے ہیں! مگر ہم نے تو اِنکم ٹیکس کی چوری بھی نہیں کی۔ پھر یہ سزا کیوں؟ بھوکا ہی مارنا تھا تو ہمیں گز بھر کی ٹائی بندھوا کے نَو منزلیں لانگتے پھلانگتے یہاں کاہے کو لائے؟ نیچے ہی نقد پیسے دے کر رُخصت کر دیتے۔''

'' ہماری صُحبتیں اُٹھاتے ایک عُمر گزری، مگر رہے جنگلی کے جنگلی! تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ 'فایو اسٹار' (اعلیٰ درجہ) ہوٹلوں میں قیمت کھانے کی نہیں دی جاتی، اِس رومانی فضا کی دی جاتی ہے، جہاں آپ دوسرے معزّزین کو اپنی طرح بھوکا مرتے دیکھتے ہیں۔ بِل میں جو رقم درج ہوتی ہے وہ بساندے گوشت اور اُبلے چقندر کی قیمت نہیں ہوتی۔ دراصل اس میں گھر سے بھاگنے کا جُرمانہ، دوسری میزوں پر بیٹھی ہوئی خواتین کے فرنچ سینٹ لگانے کا تاوان، کِھلکِھلاتی ہوئی ویٹرس کے ٹوتھ پیسٹ کی قیمت بلکہ اس کا پورا نان نفقہ شامل کرنا پڑتا ہے، جب جا کے کہیں ایک بِل بنتا ہے۔ اور جہاں تک لذّت کا تعلّق ہے تو صاحب! ہر شب آنگن میں اُترنے والے من و سلویٰ کے مقابلے میں باہر کی پیاز کی گنٹھی مزا دے جاتی ہے۔ ورنہ دیکھا

جائے تو چائے کی پیالی گھر کی انگیٹھی پر ''چراغ تلے'' جلا کر بھی بنائی جا سکتی ہے اور ـــــ اور صاحب! دس دس روپے کے نوٹ جلا کر بھی! جیسا ہاکس بے کی ''ہَٹ'' میں تمھارے اُس بمبئیا سیٹھ نے کیا تھا! مصری بیلی ڈانسر کی خاطر۔''

''مگر وہ تو خاصی Plump تھی۔''

'' صاحب! مصری تو اسی چیز پر جان دیتے ہیں۔ جبھی تو شاہ فارُوق فربہ اندام داشتائیں اِس طرح اکٹھّی کیا کرتا تھا جیسے بچّے ڈاک کے ٹکٹ جمع کرتے ہیں!''

'' بحث اور ہمیں اِس ڈھلوان پر لا کر مرزا نے سراپا کے اعدادِ ثلاثہ (مثلاً ۳۷۔۲۴۔۳۵) کی جانچ پڑتال کرنے کا خود ساختہ فارمولا پیش کیا جو بے کم و کاست نذرِ قارئین ہے:

نازنین کے سینے کے ناپ میں کُولھوں کا ناپ جوڑو۔ میزان کو اپنے (صاف) موزے کے نمبر سے ضرب دو۔ پھر اس حاصلِ ضرب کو ۳۲ سے تقسیم کردو۔ جو جواب آئے وہ کمر کا مثالی ناپ ہوگا۔ اب اگر کمر کا پھیر اس سے زیادہ نکلے تو آلو سے پرہیز لازم ہے۔ اور اگر اس سے کم ہے تو آلو کِھلا کِھلا کر جسم کو فارمُولے کے سانچے میں ڈھالا جا سکتا ہے۔

ہوٹل کے بِل کی پُشت پر اُنھوں نے بال پائنٹ قلم سے مارلِن مُنرو، جینا لولو برجیڈا ، الزبتھ ٹیلر، صوفیہ لارین اور چیدہ چیدہ پری پیکروں کو ایک ایک کر کے اپنے گیارہ نمبر کے موزے میں ایسا اُتارا کہ ہم بھونچکّے رہ گئے۔ اس میں آپ کو جھوٹ یا عبارت آرائی کا ذرا بھی شائبہ نظر آئے تو دو چار مشقی سوال نکال کر آپ بھی اپنی جان پہچان کے حسینوں کا امتحان کر لیجیے۔ ہم تو اسے ملکہ وکٹوریہ کے بُت، کوکاکولا کی بوتل اور خود پر آزما کر اپنا اطمینان کر چکے ہیں۔

۔۔۔۔ اس کی شبوں کا گُداز

ہمیں ڈیڑھ مہینے کے لئے کام سے ڈھاکہ جانا پڑا اور مرزا سے ملاقاتوں کو سلسلہ موقوف ہوگیا۔ خط و

کتابت کا مرزا کو دماغ نہیں۔ جیسے ہی ہم واپس آئے، انتّاس او مُنشی گنج کے کیلوں سے لدے پھندے مرزا کے ہاں پہنچے۔ ہم نے کہا، ''السلام علیکم!'' جواب ملا، ''پھل اندر پہنچوا دو۔ وعلیکم السلام!'' غور سے ان کی صورت دیکھی تو دل پہ چوٹ سی لگی۔

''یہ کیا حال بنا لیا تم نے؟''

''ہمیں جی بھر کے دیکھ لو۔ پھر اس صو رت کو ترسو گے۔ اشتہا ختم، دواؤں پر گزارا ہے۔ دن بھر میں تین انگور کھا پاتا ہوں، وہ بھی چھلکا اُتار کے۔ کھانے کے نام سے ہول اُٹھتا ہے۔ دل بیٹھا جاتا ہے۔ ہر وقت ایک بیکلی سی رہتی ہے۔ ہر چہرہ اُداس اُداس، ہر شے دُھواں دُھواں، یہ ہو نکتا سنّاٹا، یہ چیَت کی اداس چاندنی، یہ۔۔۔ ''

''مرزا! ہم تمہیں رومینٹک ہونے سے روک تو نہیں سکتے، لیکن یہ مہینہ چیَت کا نہیں ہے۔''

''چیَت نہ سہی، چیت جیسا ضرور ہے، ظالم۔ تم تو ایک ہندو لڑکی سے دل بھی لگا چکے ہو۔ تمہی بتاؤ، یہ کون سے مہینے کا چاند ہے؟'' مرزا نے سوال کیا۔

''اسی مہینے کے معلوم ہوتا ہے۔'' ہم نے جھجکتے ہوئے جواب دیا۔

ہمیں بھی ایسا ہی لگتا ہے۔ صاحب! عجیب عالم ہے۔ کام میں ذرا جی نہیں لگتا اور بیکاری سے بھی وحشت ہوتی ہے۔ ذہن پراگندہ ، بلکہ سچ پوچھو تو محض گندہ۔ تاروں بھرے آسمان کے نیچے رات رات بھر آنکھیں پھاڑے تمہاری حماقتیں گنتا رہتا ہوں۔ تنہائی سے دل گھبراتا ہے اور لوگوں سے ملتا ہوں تو جی چاہتا ہے منہ نوچ لوں، او رصاحب!

ایک دو کا ذکر کیا، سارے کے سارے نوچ لوں

'' مرزا! ہو نہ ہو، یہ عشق کے آثار ہیں! ''

''بجا۔ لیکن اگر صاحبِ معاملہ پر چالیس مہاوٹیں پڑ چکی ہوں، تو یہ آثار عشق کے نہیں، 'السر' کے ہیں۔کھانا کھاتے ہی محسوس ہوتا ہے گویا کسی نے حلق سے لے کر معدے تک تیزاب کی پُھریری پھیر دی ہے۔ ادھر کھایا، ادھر پیٹ پھول کر مشکیزہ ہوا۔ ہنسی کا رُخ بھی اندر کی طرف ہوگیا ہے۔ سارا فتور آلو کا ہے۔ معدے میں ایسڈ بہت بننے لگا ہے 'پیپٹک السر' ہو گیا ہے۔'' ان کی آنکھیں ڈبڈبائیں۔

'' اس میں ہراساں ہونے کی کیا بات ہے۔ آج کل کسی کو 'ہارٹ اٹیک، یا السر، نہ ہو تو لوگ اس پر ترس کھانے لگتے ہیں کہ شاید بیچارہ کسی ذمّہ دار عہدے پر فائز نہیں ہے! مگر تم تو ملازمت کو جوتے کی نوک پر رکھتے ہو۔ اپنے 'باس' سے ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بات کرتے ہو۔ پھر یہ کیسے ہوا؟ وقت پر سوتے ہو، وقت پر اُٹھتے ہو۔ دادا کے وقتوں کی چاندی کی پتیلی میں اُبالے بغیر پانی نہیں پیتے۔ وضو بھی پانی میں 'لسٹرین' ملا کر کرتے ہو، جس میں 26 فیصد الکحل ہوتا ہے۔ حالات حاضرہ سے خود کو بے خبر رکھتے ہو۔ باتوں کے علاوہ کسی چیز میں ترُشی کو روا نہیں رکھتے۔ تیل بھی تم نہیں کھاتے۔ دس سال سے تو ہم خود دیکھ رہے ہیں، منٹگمری کا خالص دانے دار گھی کھا رہے ہو۔'' ہم نے کہا۔

'' تمہیں یقین نہیں آئے گا یہ سب اسی منحوس کا فتور ہے۔ اب کی دفعہ جو سونے کے کُشتہ سے زیادہ طاقت بخش گھی، کا سر بہر کنستر اپنے ہاتھ سے انگیٹھی پر تپایا تو معلوم ہے تہ میں کیا نکلا؟ تین تین انگل آلو کی دانے دار لگدی! جبھی تو میں کہوں کہ میرا بنیان تو تنگ ہوگیا، مگر وزن کیوں نہیں بڑھ رہا!'' مرزا نے آخر اپنے دس سالہ مرض کی جڑ پکڑ لی، جو ضلع منٹگمری تک پھیلی ہوئی تھی۔

کیا اسیری ہے، کیا رہائی ہے

پہلے مرزا کو درد کی ذرا برداشت نہیں تھی۔ ہمارے سامنے کی بات ہے، پہلی دفعہ پیٹ میں درد ہُوا تو

ڈاکٹر نے مارفیا کا انجکشن تیار کیا۔ مگر مرزا نے گھگھیا کر منّتیں کیں کہ انہیں پہلے کلورو فارم سُنگھا دیا جائے تاکہ انجکشن کی تکلیف محسوس نہ ہو! لیکن اب اپنی بیماری پر اس طرح اِترانے لگے تھے جیسے اکثر اوچھے اپنی تندرستی پر اکڑتے ہیں۔ ہمیں ان کی بیماری سے اتنی تشویش نہیں ہوئی جتنی اس بات سے کہ انہیں اپنے ہی نہیں پرائے مرض میں بھی اتنی ہی لذّت محسوس ہونے لگی تھی۔ بھانت بھانت کی بیماریوں میں مُبتلا مریضوں سے اس طرح کُرید کُرید کر متعدّی تفصیلات پوچھتے کہ رات تک ان کے سارے مرض اپنا لیتے۔ اس حد تک کہ بخار کسی کو چڑھتا، سرسامی باتیں وہ کرتے۔ اس ہمدردانہ طرز عیادت سے مرزا نے خود کو زچگی کے سوا ہر قسم کی تکلیف میں مُبتلا کر لیا۔ گھر یا دفتر کی قید نہیں، نہ اپنے بیگانے کی تخصیص، ہر ملاقاتی کو اپنی آنتوں کے ناقص فعل سے آگاہ کرتے اور اس سیماب صفت ریاحی درد کا لفظی گراف بناتے جو مصافحہ کرتے وقت نفخ و قراقر کا محرک تھا۔ پھر دائیں آنکھ کے پپوٹے میں ''کرنٹ'' مارتا، متورم جگر کو چھیدتا، ٹلی ہوئی ناف کی طرف بڑھنے لگا تھا کہ پچھلے پہر اچانک پلٹا اور پلٹ کر دل میں بُرے بُرے خیال پیدا کرنے لگا اور پھر مرزا ہر بُرے خیال کو اس طرح کھول کر بیان کرتے کہ

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔

جن لوگوں نے مرزا کو پہلے نہیں دیکھا تھا وہ تصور نہیں کر سکتے تھے کہ یہ مردِ بیمار جو فائلوں پر سر جُھکائے، 'السر' کی تپک مٹانے کے لئے ہر دوسرے گھنٹے ایک گلاس دودھ منہ بنا کر پی لیتا ہے، یہ چار مہینے قبل کوفتے میں ہری مرچ بھروا کر کھاتا تھا اور اس سے بھی جی نہیں بھرتا تو شام کو یہی کوفتہ ہری مرچ میں بھروا دیتا تھا۔ یہ نیم جاں جو بے مرچ مسالے کے راتب کو ''انگلش فوڈ'' کہہ کر صبر و شکر کے ساتھ کھا رہا ہے، یہ وہی چٹورا ہے جو چار مہینے پہلے یہ بتا سکتا تھا کہ صبح سات بجے سے لے کر رات کے نو بجے تک کراچی میں کس 'سویٹ میٹ مرچنت' کی کڑھائی سے اُترتی گرم جلیبی مل سکتی ہے۔ ہاؤسنگ سوسائٹی کے کون سے چینی ریستوراں میں تلے ہوئے جھینگے کھانے چاہئیں جن کا چوگُنا بِل بناتے وقت مالک

ریستوراں کی بیٹی اس طرح مُسکراتی ہے کہ بخُدا روپیہ ہاتھ کا میل معلوم ہوتا ہے۔ انہیں نہ صرف یہ پتہ تھا کہ لاہور میں زیورات کی کون سی دُکان میں نہایت سُبک ''ہیرا تراش'' کلائیاں دیکھنے کو ملتی ہیں، بلکہ یہ بھی معلوم تھا کہ مزنگ میں تکّا کباب کی وہ کون سی دکان ہے جس کا ہیڈ آفس گوجرانوالہ میں ہے اور یہ بھی کہ کڑا کڑاتے جاڑوں میں رات کے دو بجے لال کُرتی کی کس پان کی دُکان پر پِنڈی کے مَن چلے طرح طرح کے پانوں سے زیادہ ان کے رسیلے ناموں کے مزے لوٹنے آتے ہیں۔ قصّہ خوانی کے کس مچھیل حلوائی کی دکان سے کالی گلاب جامن اور ناظم آباد کی کون سی چورنگی کے قریب گلاب میں بسا ہوا قلاقند قرض پر مل سکتا ہے[1]۔ (اطلاعاً عرض ہے کہ مرزا نقد پیسے دے کر مٹھائی خریدنا فضول خرچی سمجھتے ہیں) بھلا کوئی کیسے یقین کر لیتا کہ یہ آلو اور ''کاربو ہائی ڈریٹ'' کا شکار وہی ہے جس نے کل تک من بھاتے کھانوں کے کیسے کیسے البیلے جوڑے بنا رکھے تھے ـــــ کھڑے مسالے کے پسندے اور بیسنی روٹی، قیمہ بھرے کریلے اور گھی میں تڑتڑاتے پراٹھے، مدراسی بریانی اور پارسی کوفتے (وہ بھی ایک لکھنوی پڑوسن کے ہاتھ کے) چپڑی روٹی اور اُرد کی پھریری دال، بھنڈی اور ـــــ بھنڈی! (بھنڈی کے ساتھ مرزا کسی اور چیز کو شامل کرنے کے روادار نہیں)

مرزا کو کھانے کا ایسا ہَوکا ہے کہ ایک منہ انہیں ہمیشہ ناکافی معلوم ہوتا ہے! ان کے ندیدے پن کو دیکھ کر ایک دفعہ پروفیسر قاضی عبد القدّوس نے کہا تھا، ''مرزا تمہارا حال گرگٹ جیسا ہے۔ اس کی زبان کی لمبائی اس کے جسم کی آدھی ہوتی ہے!'' مرزا کی اُداس آنکھیں ایک دم مُسکرا اٹھیں۔ کہنے لگے، ''صاحب! خدا نے ایک پارۂ گوشت کو جانے کس لذّت سے ہمکنار کردیا۔ اگر سارا بدن اس لذّت سے آشنا ہوجاتا تو انسان اس کی تاب نہ لاتا۔ زمین کی چھاتی پھٹ جاتی!''

مرزا پانچ چھ ہفتے میں پلنگ کو لات مار کر کھڑے ہو گئے۔ ہم تو اسے ان کی قوتِ ارادی کی کرامات ہی کہیں گے، حالانکہ وہ خود کچھ اور وجہ بتاتے تھے۔ ایک دن ان کے معدے سے خون کٹ کٹ کر آنے لگا۔ ہمیں چشمِ پُر آب دیکھا تو ڈھارس دینے لگے ''میں مسلمان ہوں۔ جنّت کا بھی قائل ہوں۔ مگر مجھے وہاں

---

[1] یہ مفید مطلب معلومات مرزا کے ملک گیر چٹور پن کا نچوڑ ہیں۔ انہوں نے ساری عمر کیا ہی کیا ہے۔ اپنے دانتوں سے اپنی قبر کھودی ہے۔

جانے کی جلدی نہیں ہے۔ میں موت سے نہیں ڈرتا۔ مگر میں ابھی مر نہیں سکتا۔ میں ابھی مرنا نہیں چاہتا۔ اس لئے کہ اوّل تو تم میری موت کا صدمہ بر داشت نہیں کر سکو گے۔ دوم، میں پہلے مرگیا تو تم مجھ پر مضمون لکھ دو گے!'' خدا بہتر جانتا ہے کہ وہ خوفِ خاکہ سے صحت یاب ہوئے یا بقول شخصے مرُغی کے غسلِ میّت کے پانی سے جسے وہ چکن سوپ کہہ کر نوشِ جان فرما رہے تھے۔ بہر حال، بیماری جیسے آئی تھی، اسی طرح چلی گئی۔ فائدہ یہ ہُوا کہ آلو سے جو بیزاری پہلے بلا وجہ تھی، اب اس کی نہایت معقول وجہ ہاتھ آگئی اور یہ سراسر مرزا کی اخلاقی فتح تھی۔

مرض الحمداللہ دور ہو چکا تھا۔ پرہیز البتّہ جاری تھا۔ وہ اس طرح کہ پہلے مرزا دوپہر کے کھانے کے بعد آدھ سیر جلیبی اکیلے کھا جاتے تھے لیکن اب ڈاکٹروں نے میٹھا بند کردیا تھا۔ لہٰذا آدھ سیر امرتی پر اکتفا کرتے تھے۔

آلُو کا مُنہ کالا، بھنڈی کا بول بالا

جیسے ہی مرزا کی صحت اور طبیعت معمول پر آئی، بغدادی جم خانہ میں یار لوگوں نے شایان شان پیمانے پر غسلِ صحت کے جشن کا اہتمام کیا۔ استقبالیہ کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ گھسے پٹے ڈنر ڈانس کے بجائے فینسی ڈریس بال کا اہتمام کیا جائے تاکہ ایک دوسرے پر ہنسنے کا موقع ملے۔ مہمانِ خُصوصی تک یہ بھنک پہنچی تو انہوں نے ہماری زبانی کہلا بھیجا کہ نئے مضحکہ خیز لباس سلوانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ ممبران اور ان کی بیگمات اگر ایمانداری سے وہی کپڑے پہنے پہنے جم خانہ چلے آئیں، جو وہ عموماً گھر میں پہنے بیٹھے رہتے ہیں تو منشاء پورا ہو جائے گا۔ رقص کے لئے البتّہ ایک کڑی شرط مرزا نے یہ لگا دی کہ ہر ممبر صرف اپنی بیوی کے ساتھ رقص کرے گا، مگر اِس لپک اور ہُمک سے گویا وہ اس کی بیوی نہیں ہے! جشن کی رات جم خانہ کو جھنڈیوں اور بھنڈیوں سے دُلہن بنایا گیا۔ سات کورس کے ڈنر سے پہلے روئی اور کاغذ سے بنے ہوئے ایک قدِ آدم آلو کی ارتھی نکالی گئی، جس پر مرزا نے اپنے ہاتھ سے برانڈی چھڑک کر ماچس دکھائی اور سرُگباشی کے ''ڈمپل'' پر گاف کلب مار کے کریا کرم کیا۔ ڈنر کے بعد مرزا پر ٹائلٹ پیپر کے پھول برسائے گئے اور کچّی

کچّی بھنڈیوں میں تولا گیا جن پر ابھی ٹھیک سے سُنہری رُواں بھی نہیں نکلا تھا۔ پھر یہ بھنڈیاں مستحقین یعنی معدے کے لکھ پتی مریضوں میں تقسیم کر دی گئیں۔ شمپین سے مہکتے ہوئے بال روم میں غبارے چھوڑے گئے۔ خالی بوتلوں کی قیمت کا عطیہ ایک یتیم خانے کو دینے کا اعلان کیا گیا اور غُسلِ صحت کی خوشی میں کارڈ روم والوں نے جوئے کے اگلے پچھلے سارے قرضے معاف کر دیئے۔

مرزا بات بے بات مُسکرا رہے تھے۔ تیسرا رقص ختم ہوتے ہی ہم اپنی کُہنیوں سے راستہ بناتے ہوئے اُن تک پہنچے۔ وہ اس لمحے ایک بڑے غُبارے میں جلتے ہوئے سگریٹ سے سوراخ کرنے چلے تھے کہ ہم نے اُس کا ذکر چھیڑ دیا جس کی جناب میں کل تک گُستاخیِ فرشتہ پسند نہ تھی۔ ''مرزا! آلو اگر اتنا ہی مضر ہے تو انگلینڈ میں اس قدر مقبول کیوں ہے؟ ایک انگریز اوسطاً دس اونس آلو یومیہ کھا جاتا ہے۔ یعنی سال میں ساڑھے پانچ من! سُن رہے ہو، ساڑھے پانچ من!'' بولے، ''صاحب! انگریز کی کیا بات ہے! اس کی مُفلسی سے بھی ایک شان ٹپکتی ہے۔ وہ پٹتا بھی ہے تو ایک ہیکڑی کے ساتھ! لِن یوتانگ نے کہیں لکھا ہے کہ ہم چینیوں کے بارے میں لوگوں نے یہ مشہور کر رکھا ہے کہ قحط پڑتا ہے تو ہم اپنے بچّے تک کھا جاتے ہیں۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ ہم انہیں اس طرح نہیں کھاتے جس طرح انگریز 'بیف' کھاتے ہیں یعنی کچّا!'' ہم بھی جواباً کچھ کہنا چاہتے تھے کہ ایک نکیلی ایڑی جو ایک حسین بوجھ سہارے ہوئے تھی، ہمارے پنجے میں برمے کی طرح اترتی چلی گئی۔ ہماری مردانہ چیخ

FOR HE IS A JOLLY GOOD FELLOW

کے کورس میں دب گئی۔ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے کا برمی ساگوان کا ڈانس فلور بہکے بہکے قدموں تلے پھر چرچرانے لگا۔